رموز بیخودی — مدعائے بیان

ڈاکٹر خضر یٰسین

اسرار و رموز دونوں باہم مربوط مثنویاں ہیں، اسرار خودی میں علامہ اقبال نے ''فرد'' کے مخفی قویٰ کی نشاندہی کی ہے اور رموز بیخودی میں فرد کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ملت کی ہستی دراصل فرد کے انفرادی قویٰ کے نشو و نما کے لیے ضروری ہے۔ رموز بیخودی میں اقبال بظاہر ملت سے مخاطب ہیں اور فرد سے مخاطب نہیں ہیں مگر وہ درحقیقت فرد سے مخاطب ہیں۔ فرد کی بقا اور احیاء ملت کی صورت میں ہے۔ اسرار خودی کے عنوانات رموز بیخودی کے عنوانات سے مختلف ہیں مگر مضمون دونوں میں ایک ہے۔ دونوں مثنویوں میں علامہ اقبال شعر و شاعری کے فنی کمالات پوری طرح کام میں لاتے ہیں۔ فکری جہت کو شاعری پر غالب رکھنے کی اپنی تمنا بھی اقبال شعر میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں؛

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست
حسن انداز بیان از من مجو
خوانسار و اصفہان از من مجو
خوردہ بر مینا مگیر اے ہوشمند
دل بذوق خردہ مینا بہ بند[1]

شعر اور شاعری سے یہ بیزاری اقبال میں کیوں پیدا ہوئی تھی، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے شعر نے انہیں عزت و شہرت دی ہے؟ اقبال اپنے فکر کی عظمت کے جتنے قائل ہیں اپنے شعر کی ویسی عظمت کے قائل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ وہ شعر کو وسیلہ بنانا چاہتے تھے اور بس وسیلہ ہی رکھنا چاہتے تھے، اسے مقصد کے درجہ تک ترفع دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ فن برائے فن ہو تو شعر مقصود بالذات ہوتا ہے اور فن برائے فن نہ ہو تو شعر کا مقصد شعر سے باہر تلاش کرنا پڑے گا۔ اقبال یہ چاہتے تھے کہ ان کے شعر کو مقصود بالذات نہ بنایا

جائے، شعر میں جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں اسے غایت بنا کر شعر سے حاصل ہونے والی انفعالی لذت سے دور رہا جائے۔ اسرار و رموز کا مطالعہ ایک پہلو فنی ہے جس میں اقبال کے شعر و شاعری کے اوصاف و اطراف دیکھے گئے ہیں دوسرا پہلو وہ ہے جس میں اس غایت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے لیے اقبال نے فن شعر کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم یہاں اسی دوسرے پہلو سے اسرار و رموز کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

فارسی کے بڑے شعراء نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے خاص طور پر مثنوی فارسی زبان و بیان کے لیے دیگر اصناف سخن کی نسبت زیادہ مقبول اور زیادہ موزوں صنف رہی ہے۔ اس صنف میں شاعر اپنے مدعا کا بیان زیادہ سہولت کے ساتھ اور زیادہ سے زیادہ اشعار میں پیش کر سکتا ہے۔ حکمت و دانائی کی باتیں، قصہ کہانیاں، سماجی اور سیاسی واقعات، عشق و محبت کی داستانیں، ذاتی مشاہدات و تجربات غرض ہر طرح کی بات مثنوی میں بیان کی جا سکتی ہے۔ شاعر اپنی بات بعض اوقات بالکل فطری انداز میں کہہ دیتا ہے اور بعض اوقات سادہ اور کبھی پیچیدہ استعاراتی زبان استعمال کرتا ہے۔ یہ سب کچھ مثنوی میں بہت آسانی سے ہو جاتا ہے۔ اقبال نے خودی کے اپنے تصور مثنوی اسرار و رموز میں پیش کیے ہیں۔ دراصل یہ فارسی اساتذہ کی روایت کا تتبع تھا۔ اقبال سے قبل ہندوستان میں فارسی زبان کا بڑا شاعر غالب ہے، جس کے فارسی دیوان میں قصائد کے علاوہ طویل مثنویاں اور غزلیات ہیں۔ شعر حکمت جسے اقبال نے اپنے خطبات میں اعلیٰ شاعری (higher poetry) کہا ہے[2]، فارسی کے بڑے شعراء کا طرہ امتیاز ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ایک متعین موضوع پر توجہ مرتکز رکھی اور مذکورہ توام مثنویوں میں اس موضوع کے متعلق اپنے افکار یکجا کر دیے ہیں۔ اقبال سے قبل طویل مثنویوں کے موضوعات اس طرح کے نہیں رہے جو بیک وقت خارج میں واقعیت رکھتے ہوں اور اپنی اصل کے اعتبار سے بسیط بھی ہوں۔ غالب نے اپنی ایک مثنوی کا آغاز رومی کے شعر سے کیا ہے[3]۔ اقبال اپنی مثنوی کا آغاز رومی اور نظیری کے اشعار سے کرتے ہیں۔

اسرار خودی اجتماعیت کے ایسے جبر کی نفی ہے جس میں فرد کے ارادی اور غائی مقاصد پامال ہو جاتے ہیں اور رموز بیخودی میں ایسی انفرادیت کی نفی جس سے فرد میں اجتماع گریز رجحانات نشو ونما پاتے ہیں اور وہ اپنے لیے اور معاشرے کے لیے یا تو غیر مفید ہو جاتا ہے یا ضرر رساں بن جاتا ہے۔ یہ بہت مشکل راہ تھی جس پر اقبال نے اپنے فکر کو مرتکز رکھنا تھا، اس کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ فرد کی فردیت زائل نہ ہو اور سماج کی اجتماعیت پامال نہ ہو۔ گویا: بر کف جام شریعت بر کف سندان عشق، والی کیفیت تھی جسے اقبال کو اسرار و رموز میں مسلسل برقرار رکھنا تھا۔ اقبال سماج کو غیر معمولی حد تک پیچیدگی کا شکار اکائی دیکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ انہیں یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ سماج کو امت یا ملت کی صورت میں دیکھیں اور ایک وقت میں فرد اور معاشرے کی حرکیات کا دقیق جائزہ لینے کے بجائے سادہ شکل میں اجتماع فرض

کریں۔ ملت اسلامیہ تاریخ کے جس عمل اور ردعمل کا شکار ہو کر انتشار اور مرکزیت سے محروم ہو چکی ہے، اسے ایک نکتہ پر لے جائیں۔ اس اجتماعیت کے لیے اقبال نے فن کو فکر اور فکر کو فن (Art & Thought) بنا دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے فکر کی نمائندہ ہے اور ان کا فکر ان کی شاعری کا نمائندہ ہے۔

اسرار خودی میں اقبال فرد سے مخاطب ہیں اور وہ فرد جس سے مخاطب ہیں کوئی اور نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی ذات ہے۔ اسرار خودی میں تمہید سے قبل رومی کے چند اشعار درج ہیں، جس میں شیخ بتاتا ہے کہ انسان کی جستجو میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ تمہید میں اس انسان کی صفات بیان کی جاتی ہیں جس کی تلاش شیخ کی جستجو کا محرک ہے۔ نظیری کے شعر سے تمہید کا آغاز کرتے ہیں اور پھر ان تمام پوشیدہ قوتوں کو بیان کرتے ہیں جو فرد کی ذات میں بالقوۃ موجود ہیں۔ بعض اوقات شاعر انسان کی پوشیدہ قوتوں کو بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیتا ہے، اقبال کے بیان میں شاعرانہ تعلّی ہے مگر کہیں بھی یہ تعلّی غیر فطری غرور بنتی نظر نہیں آتی۔ تعلّی مبالغہ آمیز بیان ہوتی ہے، شاعر کو حق حاصل ہے کہ وہ ایسا کرے لیکن اگر مبالغہ غیر معمولی تجاوز پر مبنی ہو تو فطری نہیں رہتا۔ اقبال نے انسان کی قوتوں کو بیان کرنے میں مبالغہ کیا ہے مگر یہ مبالغہ شعر کی شعریت میں صرف ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسرار خودی کی تمہید میں ایک شعر ہے؛

فکرم آں آہو سرِ فتراک بست
کو ہنوز از نیستی بیروں نجست
در نمی گنجد بجو عمان من
بحر ہا باید پے طوفان من
ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت
ہمچو فکر من در معنی نہ سفت[۴]

شاعرانہ تعلّی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ شاعر شاعری سے بیزاری کا اظہار کر دیتا ہے اور خود کو شاعر کہنے اور کہلوانے کو ناپسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعر خود کو شاعر کہلوانا پسند نہیں کرتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے مدعا کو اس درجے کی شے باور کرانا چاہتا ہے کہ اس کا پیغام شاعری کے اس مقام سے بہت بلند رہے شاعری جس کی مستحق ہے۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی، بت گری مقصود نیست

حسن انداز بیان از من مجو
خوانسار و اصفہاں از من مجو[۵]

اسرار خودی کے مختلف عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کن کن مسائل کو موضوع بناتا ہے اوران کا حل بتانے کی فکر میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قادرالکلام اور بھرپور شاعر کی خوبی یہ نہیں ہے کہ وہ کن مسائل کو شعر کا رنگ دیتا ہے یا ان مسائل کا کیا حل بتاتا ہے۔ اقبال نے اسرار و رموز میں جن مسائل کو موضوع بنایا ہے وہ نہ تو عامیانہ ہیں اور نہ ہی پیش پا افتادہ ہیں۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ان کا موضوع بھی عالمی (universal) نوعیت کا ہے اور شعریت بھی انتہائی کمال کی ہے۔ شاعر کی ''قوت خیال'' (imagening power) حساس اور بلند پرواز نہ ہوتو شعر لاکھ وزن میں ہو، شعریت سے عاری ہوتا ہے۔ شعر جب تک ذہن کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے شعور کے دیگر وظائف اس وقت تک معطل رہتے ہیں یا پھر اسی جانب گامزن رہتے ہیں جس طرف شعر انہیں لے جانا چاہتا ہے۔ ذہن پر شعر کی گرفت بہت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی، جلد یا بہ دیر شعور اپنی حالت میں واپس آجاتا ہے۔ ذہن کی قوت حافظہ اس گرفت کو محفوظ نہیں رکھ سکتی البتہ اس گرفت کے کیف کو حافظے میں ایک مجسمہ بنا دیتی ہے۔ وہ شعر پھر کبھی سامنے آئے، یا اس کی یاد کسی حوالے سے شعور کے مطلع ادراک پر نمودار ہوتو حافظہ میں محفوظ کیف کے مجسمے سے آہستہ آہستہ پردہ ہٹنے لگتا ہے۔

اعلیٰ شاعری فقط فلسفیانہ مسائل کا شاعرانہ حل پیش نہیں کرتی بلکہ اعلیٰ شاعری ذہن کو کچھ قوت کے لیے کیف و سرور کے اس درجے پر لے جاتی ہے جہاں شعور انسانی ہمہ تن یک سو ہو جاتا ہے اور اپنے دوسرے وظائف سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ بڑا شاعر جب پوری کائنات پر کوئی حکم لگاتا ہے، اپنے بارے میں کوئی دعویٰ کرتا ہے یا خدا سے ہم کلام ہوتا ہے تو سننے والا اس کے بیان کے سحر میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ کائنات پر حکم لگانا ممکن نہیں ہے، یہ دعویٰ حد سے زیادہ مبالغہ آمیز ہے یا خدا پاک سے ہم کلام ہونا ممکن نہیں ہے۔ اقبال انسان کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتا ہے، کائنات کے متعلق جو بتانا چاہتا ہے اور ذات خداوند کے بارے میں جو موقف رکھتا ہے وہ ان کے شعر میں بالکل درست ہے۔ اگر کوئی دانش ور شعر اقبال سے کوئی تصور لیتا ہے اور اسے فلسفہ وجود بنانے پر اصرار کرتا ہے تو وہ دوگونہ مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ شعریت سے باہر وہ بیان اپنے درست ہونے کے جن معیارات کا محتاج ہے اسے فراہم نہیں کیے جا سکتے۔ شعریت انسان، کائنات اور خدا کے متعلق شاعر کے غیر معمولی مبالغے کو دبا دیتی ہے اور شعور جمال کی تسکین کسی حد تک شعور کو قانع رہنے اور ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن جب کوئی دانش ور شعریت کو نظرانداز کرتے ہوئے ان تصورات کو مستقل صداقت (independent truth) کا

درجہ دینے کوشش کرتا ہے تو وہ خود کو یا دوسروں کو شعور کے معمول سے محروم کرنے کا وظیفہ انجام دے رہا ہوتا ہے، یہ وہ مشکل ہے جس سے شعر حکمت کے تعلق میں بالعموم واسطہ پڑتا ہے۔

شعر اقبال کا نقاد اگر اس صورت حال کو پیش نظر نہیں رکھتا تو نہ اقبال کے فن کی انتقادی تحسین کر سکتا ہے اور نہ اقبال کی شاعرانہ حکمت کو داد دے سکتا ہے۔ زبان و بیان اور انداز بیان وقت کے ساتھ متغیر ہوتا رہتا ہے، انسان کا ذوق لطیف وقت کے ساتھ ترقی کرتا ہے۔ آج اگر فارسی زبان و بیان کی جگہ کسی دوسری زبان نے لے لی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شعر اقبال سے مطالب اور اقبال کے افکار سے ان کے شعر کو الگ کر دیں۔ آج اگر کسی کو اقبال کے اشعار کی تفہیم میں فارسی دانی کی کمی حائل نظر آتی ہے تو یہ نئی بات نہیں ہے۔ اقبال کی اپنی زندگی میں بھی فارسی دانی بہت زیادہ عروج پر نہیں تھی۔

اقبال جب فرد کو مخاطب کرتا ہے تو ظاہر ہے یہ فرد ملت اسلامیہ کا وہ ''فرد'' ہے جو تعلیم یافتہ اور ملت کے ماضی اور حال سے باخبر ہے نیز ملت کا یہ فرد مستقبل میں کچھ کر گزرنے کا آرزومند بھی ہے۔ شعر اقبال کی تفہیم کے لیے کم از کم تعلیمی استعداد فقط زبان دانی نہیں ہے بلکہ ملت اسلامیہ کے شاندار ماضی اور اندوہ ناک حال سے پوری طرح آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اقبال جب خودی کے اسرار اور بے خودی کے رموز کی نقاب کشائی کرتے ہیں تو ان کے شعر میں ایک کاٹ ہوتی ہے۔ جو ایک طرف فرد کی سلبی انفرادیت (negative individuality) کی نفی ہے اور دوسری طرف اجتماع کے غیر ضروری جبر پر چوٹ ہے۔ اسرار خودی کے مضامین فرد کے ایک پوشیدہ اوصاف کا بیان ہے اور رموز بیخودی ملت کے ساتھ وابستہ فرد کے تعلقات اور حرکیات کا بیان ہے۔ اسرار خودی میں نظام عالم کی اصل خودی بتاتے ہیں نیز ''تعینات وجود'' اور ''تسلسل حیات'' کا انحصار خودی کے استحکام سے مشروط کرتے ہیں[۶]۔ تعینات وجود، تسلسل حیات اور استحکام خودی ان تینوں تصورات کا فلسفیانہ پیش منظر اور پس منظر اور ہے۔ اگر شاعرانہ اظہار و ابلاغ کی حیثیت کو مستقل مقام و منصب نہ دیا جائے تو ''تعینات وجود'' خودی کے استحکام کی اور خودی کا استحکام تسلسل حیات کی نفی بن سکتا ہے۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمد بر فروخت

اس شعر کا مقصد شعر کے ظاہری معنی سے بہت دور ہے۔ ظاہری معنی پر اصرار شعر کی مقصدیت کو فنا کر دیگا اور اس ظاہری بیان سے اعراض شعر کی شعریت فنا کر دیگا۔ تعینات وجود کے تناظر میں دیکھا جائے تو شعر میں کہا جا رہا ہے کہ ابراہیمؑ ان اولین وجودی تعینات کا استعارہ ہے جو تسلسل حیات میں محض اس لیے فنا ہوتے ہیں کہ وجود محمدؐ کا ظہور ہو سکے۔ ایک دوسرے شعر میں اس مفہوم کو غیر معمولی شعریت میں بیان

کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خیزد، انگیزد، پرد، تابد، رمد
سوزد، افروزد، کشد، میرد، دمد[۷]

علامہ اقبال انفرادی خودی کا نمونۂ کمال اقبال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاتے ہیں۔ انسان میں جس قدر روحانی وجسمانی قوائے حیات مضمر ہیں وہ بتام وکمال آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات میں حقیقت بن کر آشکار ہو چکے ہیں۔ اسرار خودی میں عشق کو ''استحکام خودی'' کا وسیلہ بتایا ہے، مقصد کے ساتھ وفاداری کا نام عشق ہے۔ ملت اسلامیہ کے فرد کی خودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔ محتاجی اور دریوزہ گری ایک ایسا عمل ہے جس سے خودی ضعف کا شکار ہوتی ہے۔ اقبال اسرار خودی میں کہتے ہیں کہ خودی جب عشق سے مستحکم ہوتی ہے تو نظام کائنات پر حاکم بن جاتی ہے۔ خودی کے استحکام کی نفی ان کے نزدیک دراصل غالب اقوام کا ایک حربہ ہے، جس سے مغلوب اور محکوم اقوام کو تادیر محکوم بنائے رکھنا مقصود ہے۔ اسلام کی تاریخ میں تصوف تحریک کی شکل میں ابھرا ہے، اس کا نصب العین بہت اعلیٰ اور ارفع تھا مگر آگے چل خودی کی نفی کے رجحانات اس میں درآئے ہیں۔ اقبال خودی کی نفی کے رجحانات اور ان کے اسباب ومحرکات کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: افلاطون کے نظریات عالم اسلام میں اس نوع کے خیالات کا سبب ہیں۔ افلاطون کے خیالات سے احتراز ضروری ہے، اسی ضمن میں وہ حافظ شیراز کے شعر اور ان سے پیدا ہونے والے نظریہ شعر پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اقبال جس شاعر اور شعر کو پسند کرتے ہیں اس کے اوصاف بیان کرتے ہیں[۸]۔ شعر وادبیات کی اصلاح میں معاون وممد شعر وادبیات ان کے نزدیک معیاری فن ہے۔

خودی کے استحکام کی حکمت عملی میں اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی بتاتے ہیں۔ فرد کی ہستی پر مزید توجہ کرتے ہیں تو اپنی بیان کردہ حکمت عملی کا عملی نمونہ علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کی ہستی بتاتے ہیں اور ان تینوں مراحل کو ان کی ذات میں حقیقت بنتے ہوئے دیکھاتے ہیں۔ اسرار خودی کی ۱۷ویں نظم سے اقبال رموز بیخودی کے لیے تمہید بنانا شروع کرتے ہیں۔ ملت کی حیات وروایات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی کا نصب العین اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے جوع الارض نہیں ہے۔ اسرار خودی میں فرد سے اقبال کی توجہ ملت یا اجتماع کی طرف منتقل ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کے لیے بابائے صحرائی کی نصیحت بیان کرتے ہیں۔ اسرار خودی میں زمان پر توجہ کرتے ہیں تا کہ فرد اور ملت کی زندگی میں وقت کی اہمیت کا شعور اجاگر ہو۔ اسرار خودی کا اختتام ایک دعا پر ہوتا ہے۔

اسرار خودی کے عناوین ومضامین میں ایک داستان کا سا ربط نہیں ہے، ایک عنوان پر بحث مکمل

کرنے کے بعد دوسرے عنوان پر بحث و دلائل اور ایک لطیف پیرایے میں نکتہ سنجی کی جاتی ہے۔ بظاہر عناوین میں تعلیمی ربط و تعلق نظر نہیں آتا مگر تھوڑا تامل کرنے سے پتا چل جاتا ہے کہ ایک عنوان کے ساتھ آنے والا دوسرا عنوان پہلے سے متعلق اور مربوط ہے۔ اگرچہ اسرار خودی میں فرد اور اس کی پوشیدہ قوتوں کو بیان کرنے پر توجہ مرتکز کی گئی ہے تاہم اسرار کے آخر تک جاتے جاتے رموز بیخودی کے دروازے کھلتے معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال کی زیادہ توجہ ''فرد'' کی انفرادی ہستی اور اس کی بالقوۃ فطرت کو شعر میں بیان کرنے پر مرتکز رہی ہے۔ وہ اگر ملت کی وجہ سے فرد کی بیخودی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو فرد کی ہستی اور خودی کو محو نہیں کرنا چاہتے۔ بیخودی کے تصور کی روایتی تفہیم میں خودی کی نفی ہے، خودی سے اقبال کی مراد فرد کی ہستی کا فنا ہرگز نہیں ہے بلکہ ملت کے وسیع تناظر میں اپنی ہستی کو اس طرح قائم رکھنا ہے کہ اس کے نتیجے میں ملت کا وجود منور ہو جائے۔ اقبال فرد کی بیخودی نہیں چاہتے ہیں اور نہ انفرادی خودی کی نفی کے قائل ہیں۔ خودی کی روایتی تفہیم میں ''خودی'' تکبر و عناد اور بغض و کینہ سے عبارت ہے اور بے خودی انہی اخلاقی رذائل کو ترک کر دینے سے عبارت ہے۔ اقبال خودی اور بیخودی کی روایتی تفہیم کی نفی نہیں کرتے اور نہ روایتی معنی کو نظرانداز کرتے ہیں، وہ روایتی بیان کو الٹ دیتے ہیں۔ اب اقبال کے نزدیک خودی انسان کے اوصاف حمیدہ کا مظہر ہے، اپنی ذات کا وہ شعور ہے جو اپنی نسبت غلط تصور کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ رومی کے ایک شعر سے رموز بیخودی کا آغاز کرتے ہیں:

جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب[9]

پیش کش بحضور ملت اسلامیہ مثنوی رموز بیخودی کا پہلا عنوان ہے اور اس کا آغاز عرفی کے ایک شعر سے کیا گیا ہے:

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ نیست اگر با دگرے ہست[10]

''پیش کش'' کا محتاط مطالعہ اقبال کے اس منصوبے (رموز بیخودی) کے خد و خال واضح کر دیتا ہے۔ یہاں وہ ملت کی ہستی اور اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو غیر معمولی فطانت و ذکاوت کے شعر کا روپ دیتے ہیں۔ قاری ''پیش کش'' کے انداز بیان اور مضامین کی گیرائی اور گہرائی میں اس طرح منہمک ہو جاتا ہے کہ یہ احساس نہیں رہتا کہ وہ شعر پڑھ رہا ہے۔ یوں احساس ہوتا ہے جیسے ایک حقیقت ہے جو اس کے ارد گرد اس طرح موجود ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

رموز بیخودی کا بنیادی تصور ملت اور فرد کا باہمی ربط ہے۔ رموز بیخودی میں ہمیں فن از

حد پر کشش اور منطقی نظر آتا ہے اور فن کا یہی کمال ہمارے فلسفیانہ شعور کو اس منطقی تجرید کو یہ مہلت نہیں دیتا جس سے شعر میں پیش کردہ تصور کا ہم فلسفیانہ تجزیہ کر سکیں یا منطقی تحلیل سے اس تصور کی قدر و قیمت کا فیصلہ کر پائیں۔ مندرجہ ذیل شعر دیکھئے، اظہار کے حسن نے شعور علمی کو قید کر لیا ہے۔ لہٰذا ہم اس کے معنی کی طرف مدہوشی میں بھی نہیں دیکھ پاتے ہیں؛

نقش گیر اندر دلش ''او'' می شود
من ز ہم می ریزد ''تو'' می شود
ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز[۱۱]

رموز بیخودی میں ایک عنوان ''۔۔۔ملت از اختلاط افراد پیدا می شود و تکمیل تربیت او از نبوت است'' ہے۔ اس عنوان کے ماتحت تمام اشعار مندرجہ عنوان کی وضاحت ہیں اور ان تمام اشعار میں ایک شعر بھی منطقی تحلیل کا متحمل نہیں ہے، اس لیے کہ منطقی تحلیل و تجزیہ ہر جز کو الگ کرنے پر قانع نہیں ہوتا، وہ اس جز کے جواز کی ایسی دلیل کا طالب ہوتا ہے جس میں باہمی تضاد و تناقض نہ آتا ہو۔ نظری منطق اور مذہبی منطق کے مسلمات ایک نہیں ہیں اور نہ مسلمات کے باہمی ربط کی نوعیت ایک ہوتی ہے۔ مذہبی منطق میں نبی کی بعثت اور ایک صاحب دل کی نہضت ایک شے نہیں ہے۔ شعر اقبال کی انتقادی تحسین میں مذہبی اور نظری منطق کے فرق کا مسئلہ کبھی زیر بحث نہیں آ سکتا:

تا خدا صاحبدلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پردازے کہ از آوازہء
خاک را بخشد حیات تازہء
نقش پایش خاک را بینا کند
ذرہ را چشمک زن سینا کند
نکتہ توحید باز آزمودش
رسم و آئین نیاز آزمودش[۱۲]

ملت کی خارجی تشکیل کے لیے محسوسات میں دو بنیادیں درکار ہوتی ہے ایک ''تہذیبی ثقافت''، جس کے ذریعے سے افراد ملت میں کردار کی یکسانی نظر آئے اور دوسرا یہ کہ کسی ایک مقام یا جگہ کو مرکز ملت کی حیثیت حاصل ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کا مرکز بیت اللہ شریف ہے۔ مرکز ملت مرکز ارتکاز ہے

اور ملت کی یکسانی کردار کا ایک نمونہ ہے۔ اسرار خودی میں خودی کے استحکام کی شرط اور رموز بیخودی میں ملت کا حقیقی نصب العین توحید بتاتے ہیں اور اسی مقصد کے ساتھ وابستگی کو ملت کے استحکام کا سبب سمجھتے ہیں۔ مذہبی معنی میں توحید وجود باری تعالیٰ کی صفت ہے اور اس سے مراد فقط یہ کہ الہ العالم واحد یعنی ایک ہے۔ اقبال اپنی شعری بصیرت (Poetic vision) میں توحید کا مطلب وہ نہیں لیتے جو متداول چلا آ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دین ازو، حکمت ازو، آئیں ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو
عالماں را جلوہ اش حیرت دہد
عاشقاں را بر عمل قدرت دہد[۱۳]

اقبال کا شعری وجدان توحید کے جس معنی کو بیان کر رہا ہے، وہ متداول نہیں ہے:

مدعائے ما، مآل ما یکے ست
طرز و انداز خیال ما یکے ست
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک جان و یک دل و یک جاں شدیم[۱۴]

اقبال حیات ملی کا دوسرا رکن رسالت بتاتے ہیں۔ رسالت کا متداول مفہوم یہ ہے کہ اللہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے انسانوں میں سے ایک انسان پر وحی بھیجتا ہے۔ یہ وحی نبوت یا رسالت کہلاتی ہے اور جس ذات شریف پر وحی کی جاتی ہے اسے نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ اقبال جب نبوت یا رسالت کو رموز بیخودی کی رمزوں میں سے ایک رمز ظاہر کرتے ہیں تو اس کے معنی بالکل نئی شکل میں ہمارے سامنے ظاہر ہوتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو ما لاینفک است[۱۵]

شعر اقبال میں رسالت کے متداول معنی کی نفی نہیں ہے بلکہ متداول معنی پر شعر اقبال کی حکمت منحصر ہے۔ رسالت کے متداول معنی اگر پہلے سے فرض شدہ نہ ہوں تو جو اقبال معنی پیدا کرنا چاہتے ہیں سامنے نہیں آ سکیں گے۔ مذکورہ بالا اشعار میں یہ کہنا کہ ''وز رسالت در تن ما جاں دمید'' اس امر کا ثبوت ہے کہ

اقبال رسالت کے متداول معنی میں ایک ترفع پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ رسالت ہی کے باعث ملت کو یکجاں ظاہر کررہے ہیں۔ رسالت کے متداول معنی میں مقصد کا اضافہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: رسالت محمدیہ کا مقصود حریت، مساوات اور اخوت بنی نوع انسان ہے۔ حریت سے یہاں اقبال کا مقصد اجنبی اقوام کے غلبے سے نجات ہے یا حریت کے کچھ اور معنی ہیں؟ اقبال یہاں حریت سے سیاسی آزادی مراد نہیں لے رہے ہیں۔ یہ انسان کا انسان کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ مساوات سے مراد قانونی مساوات ہے یعنی ہر انسان قانون کے سامنے یکساں جوابدہ ہے اور قانون ہر انسان پر یکساں واجب النفاذ ہے۔ اخوت کا مقصد تمام انسانوں کے حقوق وفرائض کی یکسانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعہ کربلا کو حریت کی مثال بنایا ہے اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے واقعے کو اخوت کا اور سلطان مراد اور معمار کے واقعے کو مساوات کا نمونہ بتایا ہے۔[۱۶]

ملت اسلامیہ کی اساس چونکہ توحید ورسالت ہے اس لیے زمانی ومکانی قید سے بالا ہے۔ اس موقف کو بنیاد بنا کر اقبال ایک طرف ملت اسلامیہ کے لیے جغرافیائی وطنیت کی نفی کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کو زمانے کی قید سے باہر نکال لیتے ہیں اور قرآن پاک کو ملت کا آئین بتاتے ہیں۔ ایک بات ان مقدمات سے بالکل واضح ہے کہ قرآن پاک کے فہم کا حوالہ قرآن پاک خود ہے اور اس کی تفہیم زمانی ومکانی حوالوں سے بالاتر ہے۔ قرآن پاک کے متعلق یہ تصور ''متداول عقیدے'' سے بہت زیادہ ممتاز ہے۔ بالعموم قرآن پاک کی تفہیم آیات کے شان نزول سے مشروط سمجھی جاتی ہے۔ اقبال کا تصور یہ بتا رہا ہے کہ قرآن پاک کی تفہیم زمانی ومکانی حوالوں کی محتاج نہیں ہے۔

فکر اقبال میں عروج وزوال کی منصوبہ بندی ایک جیسی نہیں ہے۔ وہ دور زوال میں رونما ہونے والی بعض مشکلات کا اندازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دور انحطاط میں اجتہاد کے بجائے تقلید زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ بظاہر اقبال کے مذکور ماقبل اور عمومی موقف سے یہ بات متصادم نظر آتی ہے کہ اجتہاد کے بجائے تقلید دور انحطاط میں زیادہ کارآمد ہے۔ اقبال خاص طور پر تقلید کی نفی کرتے ہیں اور خودی کا وجود فقط اسی صورت میں متحقق مانتے ہیں جب آزادی کے ساتھ فرد اپنے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔ یہاں اقبال نے ''دور انحطاط'' کا ذکر کیا ہے، گویا انحطاط کے دور میں بہت سے برائیوں کو بوجہ مجبوری قبول کرنا پڑتا ہے، تقلید بھی ان برائیوں میں سے ایک ہے۔ دوسری بات یہ کہ ''عالمان کم نگاہ'' کے اجتہاد کو شرف قبولیت نہیں دینا چاہتے۔ تقلید انفرادی مسئلہ ہے، فرد فرد کی تقلید کرتا ہے، جماعت جماعت کی تقلید کرتی ہے۔ فرد جماعت کی یا جماعت فرد کی تقلید نہیں کرتی، تقلید اجتماعی یا ملت کا مسئلہ اس وقت ہوگا جب وہ ملت اسلامیہ کسی دوسری قوم کی تقلید کر رہی ہو۔ یہاں اقبال فرد سے مخاطب ہیں اصولاً اسے اسرار خودی کے مضامین میں ہونا

چاہیے۔ مگر اقبال افراد ملت سے مخاطب ہوتے ہیں تو انہیں بعض وجوہات کی بنا پر نصیحت کرتے ہیں کہ قدیم روش کو ترک نہ کرو، قدیم روش کو ترک نہ کرنا تقلید کے دائرے میں آتا ہے۔ جب افراد ملت کے بجائے ملت سے مخاطب ہوتے ہیں تو اسے آئین الٰہیہ کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔ [۱۷]

شعری وجدان کے ذریعے سے اقبال عمدہ اور بامعنی تراکیب بناتے ہیں، ان میں ایک ''آداب محمدیہ'' ہے۔ ملت کے اجتماعی شعور میں اس کے معنی واضح ہیں لیکن انفرادی شعور میں کثرت تعبیر کی وجہ سے متعین مفہوم پریشان خیالی کا شکار ہوسکتا ہے۔ اقبال اس پریشان خیالی سے گریز کرتے ہوئے اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں [۱۸]۔ ذہنی یا روحانی مرکزیت متعین کرنے کے بعد وہ مادی اور محسوس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حیات ملی کے لیے مرکز ملت بیت اللہ شریف ہے۔ ملت اسلامیہ کا اجتماعی نصب العین حفظ توحید اور نشر و اشاعت توحید ہے۔ ملت اسلامیہ کی توسیع کے لیے تسخیر کائنات ضروری ہے۔ نظام عالم کے قوای کی تسخیر کا مقصد وحید عالم پر قابض ہونا نہیں ہے بلکہ ملت کی توسیع یا انسانوں کو زیادہ سے زیادہ اسلام کی طرف راغب کرنا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ملت کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک فرد کی طرح ہو جائے اور یہ مقصد فقط اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ ملت کی روایت کو مضبوطی سے تھام کر رکھا جائے۔

ملت کی روایات میں سے ایک اہم روایت کی نشاندہی کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں ماں کا احترام اسلام ہے۔ یہاں اقبال دراصل عورت کے مقام کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ماں کی ہستی میں وہ پیغمبرانہ صفات دیکھتے ہیں اور امت اور ام میں معنوی تعلق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے
حرمت امت نکتہ ہا دارد بسے [۱۹]

اقبال کہتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنھا مسلمان خواتین کے لیے اسوہ کاملہ ہیں۔ خواتین اسلام سے خطاب کرتے ہوئے جن خیالات کا اقبال اظہار کرتے ہیں ان سے بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ اقبال مغرب کی آزادی نسواں کی تحریک سے بیزار ہیں اور دوسرا وہ عورت سے ایسی توقع باندھے ہوئے ہیں کہ جیسے وہ ملت کی اصل پروردگار ہے:

اے امین نعمت آئین حق
در نفس ہائے تو سوز دین حق
دور حاضر تر فروش و پرفن است
کاروانش نقد دیں را رہزن است
آب بند نخل جمعیت توئی

حافظ سرمایہ ملت توئی
از سر سود و زیاں سودا مزن
گام جز بر جادہ آبا مزن
فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوہ زہرا مبند
تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بگل زار آورد[۲۰]

اقبال کے شعری وجدان میں متعین شخصیت کی تعریف وتوصیف درحقیقت انسان کے کردار بلند کی تعریف وتوصیف ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا آخری دونوں شعروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنھا کا اسم گرامی ایک وصف کے حوالے سے بیان کررہے ہیں اور خواتین اسلام سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ بھی اسے اپنائیں۔

رموز بیخودی کے آخر میں رسالب مآب علیہ السلام کی بارہ گاہ میں ایک التجا ہے مگر اس عرض حال کے قبل اقبال نے رموز بیخودی کا خلاصہ سورہ اخلاص کی تفسیر کی صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ خلاصہ ایک خواب کا بیان ہے جس میں اقبال سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرتے ہیں اور آپ سے کسب فیض کرتے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زبانی سورہ اخلاص کی ایک ایک آیہ مبارک کے معانی کھولتے ہیں۔ توحید کے عقیدے کو بطور عقیدہ اللہ کی وحدانیت بتاتے ہیں اور جب یہ ایمانی عقیدہ عمل کی صورت اختیار کرتا ہے تو ملت کی وحدت بن جاتا ہے۔

یک شو توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن[۲۱]

"الصمد" سے اقبال یہ اخذ کرتے ہیں کہ اے مسلم تو اپنی ہستی کو عالم اسباب کا قیدی نہ بنا، جس قدر تیرے اندر صمدیت آئے گی تو اسی قدر آزاد انسان ہوگا۔

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از ارباب دون اللہ شو[۲۲]

"لم یلد و لم یولد" سے رنگ ونسل سے آزادی مراد لیتے ہیں۔ علاقائی قومیت سے دست کش ہونا ضروری سمجھتے ہیں چونکہ کہتے ہیں:

دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم
ہر کہ پابند اقلیم و جد است
بے خبر از لم یلد و لم یولد است[۲۳]

"لم یکن له کفوا احد" سے اقبال صاحب ایمان میں یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کا بھی کوئی ہمتا و شریک نہیں ہوسکتا؛

آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم در نسازد باشریک
مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرت او بر نتابد ہمسرے[۲۴]

آخری نظم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ''عرض حال'' ہے جس میں اقبال نے بڑے درد وسوز کے ساتھ اپنی صورت حال نبی علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کی ہے اور آخر میں التجا کی ہے کہ ان کو موت مدینہ منورہ میں آئے اور آپ کے روضہ اقدس کی دیوار کے سایہ میں قبر ہو تو فخر سے میں بھی آسمان سے کہہ سکوں:

بافلک گویم کہ آرامم نگر
دیدہ آغازم انجام نگر[۲۵]

حواشی وحوالہ جات

۱۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۱۱-۱۲۔

۲۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم نذیر نیازی، بزم اقبال، لاہور۔

۳۔ غالب، کلیات غالب (فارسی)، شیخ مبارک علی، لاہور، طبع اول ۱۹۶۵ء، ص۹۵۔

۴۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۶، ۷۔

۵۔ ایضاً، ص۱۱۔
۶۔ ایضاً، ص۱۲۔
۷۔ ایضاً، ص۱۳۔
۸۔ ایضاً، ص۳۵۔
۹۔ ایضاً، ص۸۰۔
۱۰۔ ایضاً، ص۸۱۔
۱۱۔ ایضاً، ص۸۷۔
۱۲۔ ایضاً، ص۸۹۔
۱۳۔ ایضاً، ص۹۱۔
۱۴۔ ایضاً، ص۹۳۔
۱۵۔ ایضاً، ص۱۰۱۔
۱۶۔ ایضاً، ص۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۹۔
۱۷۔ ایضاً، ص۱۲۶۔
۱۸۔ ایضاً، ص۱۳۲، ۱۳۳۔
۱۹۔ ایضاً، ص۱۴۹۔
۲۰۔ ایضاً، ص۱۵۴۔
۲۱۔ ایضاً، ص۱۵۷۔
۲۲۔ ایضاً، ص۱۶۱۔
۲۳۔ ایضاً، ص۱۶۳۔
۲۴۔ ایضاً، ص۱۶۴۔
۲۵۔ ایضاً، ص۱۷۰۔